انسانی تہذیب کی تاریخ میں

اسلامی ثقافت کا مقام

شبیر احمد خان غوری۔ ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی

انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ میں بے شمار قوموں نے حصہ لیا ہے۔ مگر اس شرف کے ایک تہائی حصہ کے مستحق مسلمان ہیں جنہوں نے تاریخ کے ادوار ثلاثہ میں سے ایک پورے دور میں جب کہ دنیا "قرونِ مظلمہ" کی تاریکی میں غرق تھی، اپنی علمی وثقافتی مساعی سے معمورۂ عالم کے بڑے حصہ کو بقعۂ نور بنائے رکھا۔ یہی نہیں، بلکہ اپنی اَن تھک کوششوں سے جو علمی ورثہ انہوں نے چھوڑا، اُسی کی اساس پر بڑی حد تک تہذیبِ حاضر کی بنیاد پڑی۔

سطور ذیل کا مقصد صرف اسی تاریخی واقعہ کی توضیح ہے۔

(۱) انسانی ثقافت کی تاریخ کے ادوار ثلثہ

دنیا کی ثقافتی تاریخ کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے: عہدِ قدیم، قرون وسطیٰ اور عہد حاضر

عہدِ قدیم: زمانہ ماقبل تاریخ سے ۵۲۹ء تک ممتد ہوتا ہے، جب کہ ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ قیصر جسٹینان کے حکم سے بند کر دیا گیا۔

قرون وسطیٰ: ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی سے ۱۶۳۷ء تک باقی رہتا ہے جبکہ ڈیکارٹ کی (DISCOURS DE LA METHODE) شائع ہوئی۔

عہدِ حاضر: ڈیکارٹ کی "مقالات برمناہج" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور ہنوز چل رہا ہے۔

۲) اسلام کی ثقافتی سرگرمیوں کا زمانہ

مسلمانوں کی علمی وثقافتی ترقی کا زمانہ ان ادوار ثلثہ میں سے قرون وسطیٰ کے ساتھ منطبق

ہے کیوں کہ

ا : ۵۲۹ء (جس سال مدرسہ فلسفہ کی قفل بندی کے ساتھ قرون وسطیٰ کا آغاز ہوا) کے چالیس سال بعد اسلام کی بعثت ہوئی۔ اور پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

ب : اسلامی علم و حکمت کی ترقی ۱۶۳۷ء بلکہ اس کے ایک صدی بعد تک جاری رہی، کیوں کہ ہر چند دیگر ممالکِ اسلامیہ کے اندر جو اس زمانہ میں سیاسی و معاشرتی انقلابات کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے، علم و حکمت کا چرچا برائے نام ہی رہ گیا تھا، پھر بھی اسلامی ہند میں ان علوم کی ترقی برابر جاری رہی ۱۶۳۷ء میں ڈیکارٹ کی "مقالات بر مناہج" شائع ہوئی جس کے ساتھ عہد جدید کا افتتاح، اور قرونِ وسطیٰ کے ثقافتی جمود کا اختتام ہوا، اور اسی سال شاہجہاں تخت نشین ہوا جس کے عہد حکومت میں ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" لکھی جو واقعی ہندوستانی اسلامی فلسفہ کا آفتاب درخشاں ہے (اور مقالات بر مناہج اور شمس بازغہ کی گہرائی اور گیرائی میں جو تفاوت ہے، ظاہر ہے)۔

اگلی صدی میں محمد شاہ کے عہد حکومت میں راجہ جے سنگھ اور مرزا خیر اللہ مہندس کی سرکردگی میں "رصدگاہ محمد شاہی" قائم ہوئی جو اُس زمانہ میں یورپ کے اندر بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی۔

غرض قرون وسطیٰ کے اندر جسے بجا طور پر "قرون مظلمہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، صرف ایک خطۂ زمین ہی ایسا تھا، جو علم و حکمت کی روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ "سراسینس" (SARACENS) کا ملک تھا، جو اپنی علمی و حکمی سرگرمیوں کی بنا پر مشرق تاباں اور مطلع الانوار بنا ہوا تھا، جہاں یورپی فضلاء بھی آ کر اپنے مسلمان اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے اور ان کی فیض رسانی سے مستفید ہوتے۔ بعد میں قرون وسطیٰ کے انہیں یورپی فضلاء کے ثقافتی ورثہ پر جدید یورپ نے اپنے تمدن کی فلک بوس عمارت قائم کی۔

(۳) اسلامی ثقافت کے عناصر

اسلامی ثقافت نام ہے "عرب کے سوز دروں" اور "عجم کے حسنِ طبیعت" کے متوازن امتزاج کا۔

(**ا**) عرب کا سوز دروں: اسلام کا آغاز ایسے ملک میں ہوا تھا جو کسی زمانہ میں شاید تہذیب و ثقافت کا علم بردار رہا ہو تو رہا ہو مگر بعثتِ اسلام کے قبیل تہذیب و حضارت سے زیادہ بدویت کی طرف مائل تھا۔ شاید اسی وجہ سے فردوسی نے طعنہ دیا تھا:

زشیر شتر خوردن و سوسمار　　　عرب را بجائے رسید است کار

کہ ملکِ عجم را کنند آرزو　　تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

فردوسی کا یہ طعنہ بہت کچھ قومی تعصب پر مبنی ہے۔ مگر خود مسلمان مورخین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ بعثتِ اسلام سے قبل عربوں میں کوئی قابلِ ذکر علمی و ثقافتی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ چناں چہ ابن خلدون نے صنعت و حرفت اور علم و حکمت کے اندر عربوں کی بے مائگی کی منطقیانہ توجیہہ کے لیے اپنے مقدمہ میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے، جس کا عنوان ہے:-

" فصل اس بارے میں کہ عرب ساری دنیا کے لوگوں میں صنعت و حرفت میں کمال حاصل کرنے سے دُور ہیں "

اسی طرح قاضی صاعد اندلسی نے " طبقات الامم " میں لکھا ہے:-

" رہا علم فلسفہ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے واقفیت کی نعمت سے عربوں کو محروم کر رکھا ہے، اور اُن کے مزاج میں اس سے آشنائی کی صلاحیتیں ہی پیدا نہیں کیں "

لیکن اس تہذیبی پس ماندگی کے باوجود، اُن کے اس " سوزِ دروں " کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ نہایت ہی قلیل عرصے میں وہ اپنی سعی پیہم سے دنیا کے علمی خزانوں کے وارث ہو گئے اور ان سب کے حصول کے بعد ایک نئی ثقافت کی تشکیل کی، جس نے تہذیب حاضر تک کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑا۔

(ب) عجم کا حسنِ طبیعت: عربوں کو یہ علمی ورثے عجمیوں سے ملے جو کسی زمانہ میں بڑی شاندار تہذیبوں کے عَلَم بردار رہ چکے تھے، مگر امتدادِ زمانہ سے اُن کی عظمتِ دیرینہ بھولی بسری داستان بن چکی تھی۔ یہ عربوں کا " سوزِ دروں " ہی تھا جس نے " عجم کے حسنِ طبیعت " کے گوہر ہائے گراں مایہ کو گوشۂ گم نامی سے نکالا۔

" عجم کے حسنِ طبیعت " کے گہوارے جن سے " عرب کے سوزِ دروں " نے خوشہ چینی کی، بہت تھے۔ مگر عرب عبقریت اپنی تشکیل کے لیے سب سے زیادہ ایران اور یونان کی رہینِ منت ہے۔ ایک حد تک وہ ہندوستانی علم و حکمت سے بھی متاثر ہوتے تھے۔ مگر یونانی حکمت کی عظمت و ثمروت کے پیشِ نظر دوسری تہذیبوں کے اثرات اسلامی ثقافت میں ماند ہو کر رہ گئے۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ یونانی ثقافت کا تذکرہ ناگزیر ہے، کیوں کہ اسی کے بعد اسلامی ثقافت کو اُس کے صحیح پسِ منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

(۴) یونانی ثقافت

تاریخ عہد قدیم دنیا کی بے شمار قوموں کے تہذیب و تمدن کی داستان ہے، جس کی تشکیل میں ہر قوم نے حصہ لیا تھا۔ مگر بد قسمتی سے ان ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیل تاریخی صحت کے ساتھ قلم بند کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس مبالغہ آرائی کر کے اس تاریخ کو افسانہ بلکہ "اساطیر اولین" بنا دیا ہے۔ صرف یونان کی علمی و ثقافتی مساعی ضرور تاریخی طور پر مدون کی گئی ہیں اور چونکہ اسلامی علوم کی تشکیل و ترقی بڑی حد تک یونانی علم و حکمت ہی کی رہین احسان ہے۔ اس لئے اس پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا۔

۱۔ عہد قدیم کی عظمت: یونانی ثقافت فضلائے یونان کی ہزار سالہ علمی مساعی کا نام ہے۔ اس کی ابتدا رثالیس الملطی (THALSE OF MILETUS) جس کا زمانہ ۶۲۴ تا غایت ۵۴۸ قبل مسیح ہے اور انتہا ۵۲۹ء میں جب کہ ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بند کر دیا گیا۔ اس طویل مدت میں یونانی عبقریت نے متعدد حکماء و فلاسفر پیدا کئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، ریاضی و ہئیت اور طب و دیگر طبیعیاتی علوم کو سائنٹیفک بنیادوں پر مدون کیا۔

اس عہد کی عظمت کے بارے میں مورخین رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ پروفیسر تھلی یونانی فلاسفر کی فلسفیانہ مساعی کی عظمت و اہمیت کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"انہوں نے (یونانیوں نے) نہ صرف اُس چیز کا سنگِ بنیاد رکھا جس پر بعد کی مغربی تفکیر کے تمام نظاموں کی تعمیر ہوئی، بلکہ اُن تمام مسائل کی اور اُن کے جملہ ممکنہ جوابات کی تشکیل کی، جن کے ساتھ دو ہزار سال تک یورپی تہذیب نے خود کو مشغول رکھا ہے۔ ان کا فلسفہ سادہ اساطیری قیاس آرائیوں سے لے کر پیچیدہ مگر جامع نظامہائے فکر تک ارتقار کی اُن بہترین مثالوں میں سے ہے جو کسی قوم کے یہاں پایا جا سکتا ہے۔ حریتِ فکر اور سچائی کی محبت کے اُس جذبے سے جس نے اُن کے مفکرین کو گرمائے رکھا، بڑھ کر اور کوئی مثال دیکھنے میں نہیں آئی۔ بلکہ اُس حد تک بھی دوسری اقوام کی بہت کم رسائی ہوئی ہے۔"

اسی طرح یونانیوں کے ہیئتی کمالات کے بارے میں سر جارج کارنوال لیوس نے لکھا ہے:۔

"اگر قدماء (یونانی ہیئت داں) صرف دُوربین اور گھڑی سے واقف ہوتے تو اُن کے طریقے

تقریباً تمام عملی اغراض کے لئے کافی ہوتے، ہر چند کہ وہ ارض مرکزی مفروضہ ہی کے کیوں نہ قائل رہے ہے اگر قدماء کے ہیئتی علوم عہد حاضر کے مقابلے میں کمتر صحیح اور کمتر جامع تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ انسانی معاملات کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رکھتے تھے اور اُنہوں نے تقریباً اُن تمام شعبوں کو اپنا لیا تھا، جو نبی نوع انسان کے لئے مفید ہیں "

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا ایک آرٹیکل نویس یونانی ہندسہ کے شاہکار (اصول اقلیدس) کے بارے میں لکھتا ہے :-

"علم ہندسہ کی اشکال کو اس تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی پہلی جامع اور منظم کوشش جو ہم تک پہنچی ہے، تمام ادبی شاہکاروں میں بہترین تصنیفوں کے اندر محسوب ہونے کی مستحق ہے۔ ہماری مراد اقلیدس اسکندروی کی اصول الہندسۃ والحساب سے ہے۔ اس قدیم علمی شاہکار کے کم و بیش حرفی تراجم پچھلی نسل کے زمانہ تک انگلستان کے تمام پبلک اسکولوں میں درسی کتاب کی حیثیت سے متداول تھے۔ آج بھی تمام ممالک میں ہندسہ کی نصابی کتابیں اصول اقلیدس ہی کی ترتیب و تحریر پر مبنی ہیں "

اس ہزار سالہ مدت کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے، قبل سقراطی دور۔ یونانی فلسفہ کا عہد زریں (سقراط افلاطون اور ارسطو کا زمانہ)۔ بعد ارسطاطالیسی دور (جو رواقیت، ابیقوریت اور ارتیابیت نیز انتخابیت کی تحریکوں پر مشتمل ہے) اور یونانی فلسفہ کا عہد آخر (جو نام ہے یونانی یہودی فلسفہ، نو فیثاغورثیت اور نو افلاطونیت کا)۔ (تفصیل غیر ضروری ہے)۔

۲۔ یونانی حکمت کا مثلِ اعظم :- یونانی ثقافت کا واسطہ العقد اور حکمت یونانیان کا مثل اعظم ارسطو تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے "طبقات الامم" میں لکھا ہے :-

"اور ارسطو پر یونانیوں کا فلسفہ ختم ہوگیا۔ وہ اُن کے حکماء کا خاتم اور اُن کے علماء کا سردار ہے "

ارسطو سکندر کا ہم عصر تھا۔ جس سال سکندر نے وفات پائی، اُس کے اگلے سال اُس نے بھی انتقال کیا۔ مگر اُس کے شاگردوں نے اُس کی علمی روایات کو زندہ رکھا۔

سکندر کے انتقال پر اُس کی وسیع سلطنت اُس کے جرنیلوں میں تقسیم ہوگئی۔ مصر بطلیموسی خاندان کے حصہ میں آیا۔ جس نے تقریباً تین سو سال تک حکومت کی۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ یونانی علم و حکمت کو بھی

لائے تھے۔ اُن کے عہدِ حکومت میں اسکندریہ یونانی ثقافت اور یونانی علوم کا گہوارہ اور دنیائے علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا۔ بطالمہ ہی نے اسکندریہ کی مشہور لائبریری قائم کی تھی۔ اُنہیں کے زمانہ میں ریاضی و ہیئت کے مشاہیر فضلاء اقلیدس، بطلیموس، ارشمیدس و ابلونیوس، ذیوفنطس اور ایرن وغیرہ پیدا ہوئے، جن کا ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں خاص مقام ہے۔ ان کے علاوہ شاگردانِ ارسطو کی ایک جماعت بھی اسکندریہ پہنچ گئی تھی، جہاں انہوں نے اسناد کی علمی روایات کو جاری رکھا۔

بطلیموسی خاندان کی آخری تاجدار کلیوپیٹرا تھی۔ جس کے زمانہ میں قیصر اوغسطس نے حملہ کیا اور مصر کو فتح کر کے رومی سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا۔ یہ ۳۰ ق۔م کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں مدرسہ فلسفہ کا صدر اندرونیقوس تھا، جسے قیصر اپنے ہمراہ روم لے گیا۔ مگر وہ اپنا جانشین اسکندریہ میں چھوڑ گیا اور اس جانشین اور اس کے شاگردوں نے اپنے اساتذہ کی علمی و عملی سرگرمیوں کو بعد میں برقرار رکھا۔ لیکن آخر زمانہ میں مسیحی تعصب کی وجہ سے یہ مدرسہ گوشہ گمنامی میں پڑ گیا۔ پھر بھی مخالفین کی آزار رسانیوں کے باوجود یہ ادارہ کسی نہ کسی طرح باقی رہا۔ تاآنکہ عربوں نے مصر کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد بھی یہ مدرسہ اسکندریہ میں چلتا رہا۔ مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں یہ اسکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہو گیا۔

۲۔ یونانی ثقافت کی کہنگی و بوسیدگی:۔ آخر کار امتدادِ زمانہ سے یونانی عبقریت کے سوتے خشک ہو گئے۔ تقلید و جمود کے علاوہ جو ہر ترقی پذیر تحریک کے خاتمہ کی علامت ہے، ان لوگوں میں اختراع و ایجاد اور معقولیت پسندی کے بجائے توہم پرستی اور تعصب و تنگ نظری پیدا ہو گئی۔

(ا)۔ توہم پرستی: یونانی ثقافت کے آخری دَور کے علَم بردار نوفلاطونی تھے، جن کے بارے میں ولیم نیسل لکھتا ہے:۔

"یہ فلسفی متعدد دیوتاؤں کی پرستش کے آخری حامی تھے۔ لیکن تکثیر نے ان کے ہاں فلسفیانہ توجیہہ اختیار کر لی تھی"۔

نوفلاطونی مکتبِ فکر کا بانی فلاطینوس (PLATINUS) ہے۔ اس کے بارے میں پروفیسر تھلی لکھتا ہے:۔

"فلاطینوس شرک و تکثیر کا انکار نہیں کرتا۔ دیوتا بھی الوہیت کے مظاہر ہیں۔ وہ عالم تحت القمر

میں اچھے اور بُرے جنات اور بھوت پریتوں کا قائل ہے "

اُس کے متبعین کے بارے میں یہی فاضل پروفیسر لکھتا ہے :-

" اُس کے بہت سے متبعین نے ان توہمات میں بے حد مبالغہ کیا، عوامی شرک و تکثیر کی حمایت کی، عیسائی مذہب پر حملے کئے اور جادو اور خرافات میں انہماک اختیار کیا "

اس توہم پرستی کا سب سے بڑا نوفلاطونی علم بردار ایاملیخس تھا جس کے بارے میں ولیلم نیسل لکھتا ہے :-

" ایاملیخس کے یہاں فوق الارضی دیوتاؤں کے علاوہ ارضی دیوتا بھی ہیں .... ان کے بعد جنات ملائکہ اور ابطال آتے ہیں۔ قومی دیوتاؤں کو بھی وہ اس وہمی نظام میں جگہ دیتا ہے۔ بتوں کی پوجا، جھاڑ پھونک، جادو، پیشین گوئی وغیرہ کی بھی وہ اسی قسم کی توجیہہ کرتا ہے "

اسی طرح پروفیسر تھلی لکھتا ہے :-

" اس کے نظام معتقدات میں توہم پرستی فرفوریوس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم کردار انجام دیتی ہے "

ب :- عام طور پر فلاسفہ بڑے روشن خیال اور وسیع المشرب سمجھے جاتے ہیں۔ مگر ان متاخر یونانی فلاسفہ نے تو مسیحیت آزاری کی حد کر دی۔ اس کی تفصیل یہ ہے :-

جس زمانہ میں رومیوں نے مصر کو فتح کیا، اُس کے کچھ ہی عرصہ بعد مسیحیت کا ظہور ہوا۔ نیرو (۵۴ء-۶۸ء) کے عہد میں وہ مصر کے اندر داخل ہوئی اور جلد ہی مقبول ہونے لگی۔ مگر اپنی روزافزوں مقبولیت اور بادشاہ پرستی سے انکار کی بنا پر سلطنت کے لئے خطرہ سمجھی جانے لگی۔ بنا بریں عیسائیوں پر جور و تعدی کا آغاز ہوا۔ اُن کی مذہبی آزادی چھین لی گئی اور وہ ترکِ مذہب کے لئے مجبور کئے گئے۔

اس جور و تعدی کے دَوران میں فلاسفہ نے بھی مسیحی مذہب کو ہدفِ مطاعن بنایا۔ پہلے رواقیوں نے عیسائی مذہب پر اعتراضات کئے۔ بعد میں نوفلاطونی فلاسفہ نے اس اوچھے ہتھیار کو آزمایا۔

ان نوفلاطونی فلاسفہ میں فرفوریوس خاص طور سے مشہور رہے، ویسے تو دانش و حکمت میں وہ ارسطو کے نوفلاطونی متبعین میں خاص مقام رکھتا ہے۔ مگر مذہبی معاملات میں وہ بڑا تنگ نظر تھا۔ چنانچہ ولیلم نیسل اُس کی توہم پرستی کے ساتھ اُس کی تنگ نظری کا بھی شاکی ہے :-

"عیسائیوں کے خلاف پندرہ دفتروں میں وہ اپنے قومی مذہب کی حمایت کرتا ہے اور اس بارے میں جنات کی نسبت تمام مروّجہ توہمات سے مدد لیتا ہے ...... خونی قربانیاں وغیرہ ایسی چیزیں جن کو فی نفسہٖ بُرا سمجھتا ہے، اُن کو عبادت عامہ میں خبیث روحوں کو شکست دینے کے لئے جائز قرار دیتا ہے۔"

۴۔ یونانی ثقافت کا خاتمہ:۔ ظاہر ہے کوئی تہذیب توہم پرستی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ کوئی اجتماعی نظام تعصب و تنگ نظری اور زیردست آزاری کے ساتھ زیادہ عرصہ تک برقرار رہ سکتا ہے۔ اس لئے یونانی ثقافت (جس کے بچانے کی یہ نوفلاطونی حکمار کوشش کر رہے تھے) کا خاتمہ بھی فطری تھا۔ چنانچہ پروفیسر ھٹی لکھتا ہے:۔

"لیکن اب اس فلسفہ میں کوئی جان نہیں رہ گئی تھی۔ قدیم شرک و تکثیر میں جان ڈالنے اور پرانی تہذیب کے بچانے کے سلسلے میں اس کی ساری کوششیں بے سود تھیں۔ یہ فلسفہ اپنی افادیت کے دن ختم کر چکا تھا۔"

چنانچہ ۵۲۹ء میں قیصر جسٹینیان نے ایتھنز کے مدرسہ فلسفہ میں قفل ڈال دیا اور فلاسفہ کو جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ ویبر لکھتا ہے:۔

"۵۲۹ء میں شرک پسند نوفلاطونیت کی آخری جائے پناہ یعنی ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ جہاں برقلس نے تعلیم دی تھی، شاہنشاہ جسٹینیان کے حکم سے بند کر دیا گیا۔"

لیکن یونانی ثقافت کی ناکارگی کا احساس اتنا عام ہو چکا تھا کہ تاریخ کے اتنے اہم واقعہ کو بھی کسی نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ویبر آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"عہد ماضی کے اس منہدم آثار سے عوام اس درجہ بے پروا تھے کہ شاید ہی کسی نے اس شاہی اعلان کی طرف توجہ دی ہو۔"

۵۔ اساقفہ کا تعصب اور ثقافت بیزاری:۔ یونانی ثقافت کے خاتمہ کی اصل وجہ اُس کی ذاتی کمزوری تھی۔ اب یہ بدلے ہوئے زمانہ کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ ترقی پذیری کے تمام رجحانات ختم ہو چکے تھے۔ مگر اس ذاتی کمزوری کے علاوہ ایک خارجی موثر بھی اس کی بربادی میں کارفرما تھا۔ یہ پادریوں کا تعصب اور اُن کا ثقافت بیزار جذبہ تھا۔ مزید تفصیل حسب ذیل ہے:۔

عرصہ تک مسیحی لوگ رومن امپائر میں معتوب رہے۔ مگر آخر کار ۳۲۳ء میں قسطنطین اعظم تخت

نشین ہوا جس نے کچھ دن بعد عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اب مسیحیت رومن امپائر کا ملکی مذہب قرار پائی۔ لیکن سیاسی اقتدار ملتے ہی یہ مظلوم اور ستم رسیدہ مسیحیت ظالم و ستم گار بن گئی۔ رومن امپائر کی اگلی دو سو سال کی تاریخ مذہبی تشدد و تنگ نظری اور فرقہ وارانہ کش مکش کی مسلسل داستان ہے۔

قیصر تھاؤڈوسیوس (THEODOSIUS زمانہ ۳۷۹ - ۳۹۵ء) کے تخت نشین ہونے پر رومی مملکت کے تمام باشندوں کو بالجبر عیسائی بنانے کی کارروائی پر سختی سے عمل کیا گیا۔ پادریوں نے بلا کسی استثنار کے تمام مندروں کو برباد کرنا شروع کیا۔ مگر سرافیس کے مندر کے معاملہ میں بلوہ ہو گیا۔ بڑی خونریزی کے بعد عیسائیوں نے اسے منہدم کر کے گرجا بنا لیا۔ اس مذہبی جنون کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ سرافیون کی لائبریری جو بطلیموس فلاڈلفیوس کی لائبریری (کتب خانہ اسکندریہ) کے جل جانے پر اس کی جگہ قائم ہوئی تھی ۳۹۱ء میں اس تعصب و تنگ نظری کا شکار ہو گئی۔ اور اس کے بعد کریفٹن ملئی کے لفظوں میں:-

"چوتھی صدی میں شہر اسکندریہ کے اندر کسی لائبریری کا وجود نہیں ملتا اور یہ فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کسی مذہبی یا ملکی حاکم نے کسی کتب خانہ کی نگہداشت کی زحمت گوارا کی ہو"

تھاؤڈوسیوس کے آخر عہد حکومت میں سائرل مصر کا اسقف اعظم بنا۔ اس نے مدارس فلسفہ کو بھی اپنے تعصب و تنگ نظری کا نشانہ بنایا، کیوں کہ اس کے خیال میں یہی مدارس جاہلیت و ثنیت کے مرکز تھے۔ اس کے اشارے سے فلاسفہ پر حملہ ہوا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا تاریک ترین پہلو عقیل و فہیم ہائی پیشیہ (HYPATIA) کا دردناک قتل تھا۔ جو اسکندریہ کی نوفلاطونی جماعت کی صدر تھی۔ تاریخ فکرِ انسانی کا یہ گھناؤنا سانحہ ۴۱۵ء میں پیش آیا۔

پادریوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے علم و حکمت کی ترقی کو بھی قانوناً بند کر دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی تنگ نظری کا شدید ترین حملہ منطق پر ہوا۔ چناں چہ ابن ابی اُصیبعہ نے فارابی سے نقل کیا ہے:-

"اسی طرح سے کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مسیحیت کا زمانہ آیا تو فلسفہ کی تعلیم روم سے ختم کر دی گئی اور صرف اسکندریہ میں باقی رہ گئی۔ پھر نصرانی بادشاہ نے فلسفہ کی تعلیم پر غور کیا۔ پادری لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے باہم اس امر میں مشورہ کیا کہ فلسفہ کی کتنی تعلیم باقی رکھی جائے اور کتنی بند کر

دی جائے۔ اس پر یہ رائے ہوئی کہ منطق کی کتابوں میں سے اشکال وجودیہ تک کی تعلیم دی جائے، اور اس کے بعد کی تعلیم نہ دی جائے، کیوں کہ اس سے نصرانی مذہب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، اور جتنے حصہ کی تعلیم باقی رکھی گئی تھی، اُس سے اُن کے مذہب کی تائید میں مدد مل سکتی تھی۔ پس منطق کی اتنی ہی تعلیم کا رواج رہا، اور باقی غیر مروج ہو گئی"

فارابی کی اس روایت کی تصدیق رینان اور اسٹینشنبڈر نے بھی کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ارسطا طالیسی منطق کے سریانی تراجم ہمیشہ "انالوطیقائے اولیٰ" (ANALYTICAE PRIOR) کی ساتویں فصل پر ختم ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہمت شکن حالات میں مدارس فلسفیہ کا باقی رہنا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ ماکس مایر ہوف (MAX MEIRHOE) لکھتا ہے:۔

"اس زمانہ میں کسی عام فلسفی مدرسہ کا وجود فرض کرنا بھی مشکل ہے، کیوں کہ اس وقت سے مذہبی تعصب بڑھتا گیا اور اس نے دشمنی معلّمین و تلامذہ کے لئے زندگی دشوار کر دی۔"

پھر بھی اسکندریہ کا مدرسہ فلسفہ جس کا صدر ظہور مسیحیت کے قریبی زمانہ میں اندرونیقوس تھا، کسی نہ کسی طرح باقی رہا (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے)۔

(۵) قرونِ وسطیٰ اور مسیحی مغرب کی تہذیبی پس ماندگی

۵۲۹ء میں ایتھنز کا مدرسہ فلسفہ بالجبر بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ثقافتی تاریخ کا عہد قدیم ختم ہوا۔ اسی کے بعد قرون وسطیٰ کا آغاز ہوا۔ قرون وسطیٰ کو تاریخ میں "قرون مظلمہ" (DARK AGES) کے نام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اگر اسلام کی ثقافتی سرگرمیوں سے صرف نظر کر لیا جائے تو اس دَور کے لئے یہ بالکل ہی مناسب نام ہے۔ اس لئے فضلاء اسلام کی ثقافتی مساعی کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے ہم عصر یورپی فضلاء کی کاوشوں کا ایک اجمالی تذکرہ نظر کے سامنے رکھا جائے۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کو "قرونِ مظلمہ" (DARK AGES) بھی کہا جاتا ہے اور اگر اُن مساعی سے صرف نظر کر لیا جائے جو اس زمانہ میں اسلامی ممالک کے اندر ظہور پذیر ہوئیں تو یورپی تاریخ کے اس دَور کے واسطے یہ بالکل موزوں نام ہے۔ چنانچہ ڈی ولف نے اس عہد کے بارے میں ایک مؤرخ کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

"۵۲۹ء سے لے کر جس سال قیصر جسٹینیان نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۷ء تک جس سال ڈیکارٹ کی مقالات بر مناہج شائع ہوئی، نیند کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا، یا یوں کہیئے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو تفکر و رویت کے حضور میں لانا ہی بند کر دیا تھا"

قرون وسطےٰ کی ابتدائی صدیوں کی ناکارگی کے بارے میں مورخ فلسفہ پروفیسر تھلی لکھتا ہے:۔

"ساتویں اور آٹھویں صدی غالباً ہماری مغربی یورپی تہذیب کا تاریک ترین دور ہیں جو لامحدود جہالت اور وحشت و بربریت کا عہد ہے۔ اس جہالت و بربریت کے دور میں کلاسیکی عہد ماضی کے ادبی اور فن کارانہ کمالات بالکلیہ فراموش ہو گئے"

یہ مغربی یورپ کی ثقافتی حالت پر تبصرہ ہے۔ مگر مشرقی یورپ کی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہ تھی، چنانچہ ڈی ولف آخری یونانی حکماء کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتا ہے:۔

"نو فلاطونیت کے آخری نمائندوں تامسطیوس اور برقلس کی بازنطینی قلمرو میں آمد و رفت تھی۔ مگر ان کے بعد ہمیں آٹھویں صدی سے قبل کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا"

اور آٹھویں صدی کا یہ "قابلِ ذکر فاضل" ولف کی تصریح کے مطابق یوحنائے دمشقی ہے جو تاریخ سے زیادہ افسانہ کا ہیرو بننے کا مستحق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بازنطینی حکمران اپنی سعی و کوشش کے باوجود ملک کو ثقافتی جمود و غفلت سے بیدار کرنے میں ناکام رہے تھے۔ چناں چہ ولف دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"مشرق کے مسیحی بادشاہ نے متعدد بار قسطنطنیہ میں فلسفہ کا ایک مستقل مدرسہ جاری کرنے کی اور اس طرح نئے دار السلطنتہ کو ایتھنز اور اسکندریہ کا حریف بنانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔۔۔

۶۱۸ء میں شاہنشاہ ہرقل نے اسکندریہ کے ایک اُستاد کو اس امید میں قسطنطنیہ بلایا کہ شاید اُس کی تعلیم بازنطینی عبقریت کو اُس کے جمود و غفلت سے بیدار کر دے۔ لیکن یہ سعی، سعی ناکام ہی ثابت ہوئی۔ صرف مستقبل بعید ہی کی نسلوں کو اس بیداری کو دیکھنا لکھا تھا"

گوبرٹ جو بعد میں سلوسٹر دوم کے نام سے پوپ کے عہدہ پر فائز ہوا، اُس نے بشپ آف اورلینز کے لئے جو تقریر مرتب کی تھی، اُس میں لکھا تھا:۔

"یہ بات قابل غور ہے کہ روم کے اندر ایک شخص بھی اتنا پڑھا لکھا نہیں ہے کہ وہ دربان کے کام پر مقرر کئے جانے کا اہل ہو جس شخص نے خود کچھ تعلیم نہ پائی ہو، وہ کس منہ سے تعلیم کے

فرائض انجام دے سکتا ہے "

یہ دسویں صدی مسیحی کی کیفیت ہے۔ بعد کی تین صدیوں اور اُن کے بعد کے زمانے کے متعلق ولف ٹین وغیرہ مورخین کے اقوال نقل کرتا ہے :۔

" ٹین کا خیال ہے کہ تیرھویں صدی کے فحول فضلائے (یورپ) کا زمانہ محض ناکارہ لوگوں کا زمانہ ہے جو نفرت وحقارت کے سوا کسی اور بات کا مستحق ہی نہیں۔ اس تاریک عرصہ کی تہہ میں جو تین صدیاں گزری ہیں، انہوں نے انسان کے عقلی ورثہ میں ایک نئے تصور کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ دوسرے لوگوں کی رائے ہے کہ قرون وسطےٰ کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے۔ یہ لوگ اس زمانہ کو انسانیت کے لئے موجب ننگ وعار سمجھتے ہیں "

(۶) تصویر کا دوسرا رُخ ۔ اسلامی مشرق کی درخشانی

۱۔ قرون وسطیٰ کی یورپی اور اسلامی ثقافت کا تقابل : قرون وسطیٰ کی ظلمت وتاریکی میں جبکہ یورپ جہالت دلپس ماندگی کا تیرہ مغاک بنا ہوا تھا، ربع سکوں کا ایک حصہ ایسا بھی تھا، جو علم و حکمت کی روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا۔ چنانچہ ڈریپر مسیحی یورپ اور قلمرو اسلام کی علمی وثقافتی سرگرمیوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

" یورپ کے قدیم باشندوں کی بربریت کے ذکر کے بعد اندلس کی اسلامی تہذیب کا تذکرہ کس قدر خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ یورپ کے ان قدیم باشندوں کے بارے میں مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بربریت و وحشت کی منزل سے آگے ترقی کر چکے تھے۔ ان کے بدن گندے تھے، دماغ توہمات سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ لوگ مزاروں کی کرامات اور ادعائی تبرکات کے متعلق ہر قسم کے بے سروپا افسانوں میں اعتقاد کامل رکھتے تھے (اس کے مقابلہ میں اندلس کی اسلامی تہذیب کس قدر خوش آئند معلوم ہوتی ہے) جب کہ ہم یورپ کے جنوب مغربی گوشہ اسپین پر نظر ڈالتے ہیں، جہاں بالکل ہی مختلف حالات کے تحت علم وحکمت کے انوار تاباں کی روشنی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مغرب میں ہلال (اسلامی تہذیب) بدر کامل بن کر مشرق (وسطی یورپ) کی طرف جانے والا تھا "

یہی مصنف اندلس کے حکمران طبقہ کی علمی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"جو نہیں عربوں کو اسپین میں مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع ملا، وہیں انہوں نے ایک روشن دور کا آغاز کیا...... قرطبہ کے امیروں نے خود کو علم و ادب کا سرپرست بنا کر ممتاز کر لیا اور ذوق سلیم کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو یورپ کے دیسی شہزادوں کی حالت کا بالکل عکس تھی۔"

اس کے بعد وہ ان علمی سرپرستیوں کا ایک اجمالی تذکرہ بیان کرتا ہے:-

"اُنہوں نے تمام بڑے بڑے شہروں میں لائبریریاں قائم کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ستر سے زیادہ لائبریریاں اُس زمانہ میں موجود تھیں۔ ہر مسجد کے ساتھ ایک عوامی مکتب ہوتا تھا، جہاں غریبوں کے بچوں کو نوشت و خواند اور قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی۔ صاحب استطاعت لوگوں کے لئے علمی مجامع (اعلیٰ مدارس) تھے جہاں ایک بڑا عالم صدر ہوتا تھا۔ قرطبہ، غرناطہ اور دوسرے بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں تھیں۔ ان یونیورسٹیوں میں بعض پروفیسر ریاضی و ہیئت کی تعلیم دیتے تھے...... ان کے علاوہ مخصوص فنون کے واسطے خصوصی مدارس تھے، بالخصوص طب کے لئے۔"

ایک اور فاضل کارادی" اپنے مقالہ" ریاضی و ہیئت" میں جو اُس نے" لیگیسی آف اسلام" مرتبہ آرنلڈ کے واسطے لکھا تھا، رقمطراز ہے:-

"عربوں (مسلمانوں) نے اُس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم اور علم و حکمت کے مطالعہ کو زندہ رکھا، جب کہ مسیحی مغرب (یورپ) بربریت کے ساتھ جان توڑ لڑائی کر رہا تھا۔ اُن کی علمی سرگرمیوں کا عہد نویں دسویں صدی میں متعین کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اُن کی یہ سرگرمیاں پندرھویں صدی تک جاری رہیں۔ بارھویں صدی کے بعد ہر شخص جسے علم و حکمت کا ذرا سا بھی شوق ہوتا یا نورِ علم کی تھوڑی سی بھی خواہش ہوتی تو وہ یا مشرق (بغداد) کا سفر کرتا یا اسپین کا۔"

لیکن ڈریپر کہتا ہے کہ تحصیل علم کے لئے اسپین کا سفر شائقین علم نے دسویں صدی مسیحی ہی سے شروع کر دیا تھا۔

"دسویں صدی مسیحی ہی سے جن لوگوں کو حصول علم کا شوق ہوتا، یا تہذیب و ثقافت کا ذوق رکھتے، وہ ہمسایہ ممالک سے اسپین پہنچتے اور بعد کے زمانہ میں تو اس رسم پر لوگوں کا عمل بہت زیادہ بڑھ گیا، بالخصوص جب کہ گربرٹ نے اپنی غیر معمولی ترقی سے ایک شاندار مثال قائم کر دی۔ کیوں کہ وہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرطبہ کی اسلامی یونیورسٹی ہی سے پڑھنے کے بعد پوپ کے عہدہ پر فائز ہوا تھا۔"

مگر قرونِ وسطیٰ کے یورپی فضلاء میں گربرٹ (پوپ سلوسٹر دوم) اکیلا شخص نہیں ہے، جس نے اسلامی اسپین کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہو۔ قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں یورپی فضلاء سے بھری رہتی تھیں اور یہیں سے فارغ ہو کر وہ مغربی تہذیب و ثقافت کے شمع بردار بننے کے لئے تیار ہو کر نکلتے تھے۔ ڈریپر دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"اسپین کی یونیورسٹیاں اقطاعِ یورپ کے علمائے دینیات سے بھری رہتی تھیں۔ پیٹر دی وینربل جو ابیلارڈ کا دوست اور مربی تھا، جس نے قرطبہ میں کافی وقت گزارا تھا اور جو نہ صرف روانی سے عربی بول سکتا تھا، بلکہ جس نے قرآن کریم کا لاطینی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا، بیان کرتا ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ اسپین پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ یورپ حتیٰ کہ انگلستان کے بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص وہاں ہیئت کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں"

لیکن اسپین سے زیادہ علم و حکمت کا چرچا عراق و ایران میں تھا، جس کا تذکرہ ایک مستقل پیش کش کا مقتضی ہے۔

۲۔ عباقرۂ اسلام:۔ اسلامی عبقریت نے بے شمار فضلاء پیدا کئے، جن میں سے بعض مشاہیر کے نام حسبِ ذیل ہیں:۔

ا۔ منطق و فلسفہ: ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی، ابوالعباس احمد بن الطیب السرخسی، ابو زید احمد بن سہل البلخی، ابو نصر الفارابی، ابوالحسن العامری، شیخ بو علی سینا، بہمن یار، ابوالعباس اللوکری، عمر الخیام، ابوالبرکات بغدادی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، شہاب الدین سہروردی مقتول، امام فخر الدین رازی، محقق نصیر الدین طوسی، علامہ قطب الدین شیرازی، سراج الدین ارموی، افضل الدین خونجی، اثیر الدین ابہری، نجم الدین کاتبی، شمس الدین خسروشاہی، سیف الدین آمدی، میر سید شریف جرجانی، محقق دوانی، مرزا جان شیرازی، میر باقر داماد، ملا صدر الدین شیرازی، ملا محمود جونپوری، میر زاہد ہروی، ملا محب اللہ بہاری۔

ب۔ طب: علی بن ابن الطبری، ابوبکر محمد بن زکریا الرازی، علی بن العباس المجوسی، ابو منصور قمری، شیخ بو علی سینا، ابن رضوان مصری، ابوالقاسم زہراوی ابن زہر، علی بن عیسیٰ الکحال، ابن النفیس۔

ج۔ ریاضی و ہندسہ: محمد بن موسیٰ الخوارزمی، عباس بن سعید الجوہری، سند بن علی، بنو موسیٰ، ملا

علی بن عیسیٰ الماہانی، ابوالعباس فضل بن حاتم النیریزی، ابراہیم بن سنان، ابو کامل شجاع بن اسلم، ابوجعفر الخازن، ابوالوفاء البوزجانی، ابوسہل ویجن بن رستم الکوہی، ابونصر بن عراق، ابن الہیثم، ابوالجود، ابوبکر الکرخی، الاستاذ المختص ابوالحسن علی بن احمد النسوی، عمر خیام، ابوالفتح محمود اصفہانی، محقق طوسی، شمس الدین سمرقندی۔

د۔ ہیئت: محمد بن ابراہیم الفزاری، یعقوب بن طارق، محمد بن موسیٰ الخوارزمی، یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبدالملک المروزی، عباس بن سعید الجوہری، سند بن علی، الکندی، حبش الحاسب، ابومعشر البلخی، ابوحنیفہ الدینوری، جابر بن سنان البتانی، ابوالعباس فضل بن حاتم النیریزی، سلیمان بن عصمہ، عبدالعزیز الہاشمی، ابوجعفر الخازن، ابن الاعلم، کوشیار ابن لبان، احمد بن عبدالجلیل السجزی، عبدالرحمان العلوفی، ابوسہل ویجن بن رستم الکوہی، ابوالوفاء البوزجانی، ابوحامد الصغانی، ابومحمود الخجندی، ابوالحسن علی بن احمد النسوی، ابونصر بن عراق، ابوریحان البیرونی، محمد بن احمد المعموری، عمر الخیامی، ابوالفتح عبدالرحمٰن الخازن، ابن یونس (صاحب الزیج الحاکمی)، ابن الصفار، ابن اسیح الزرقیال، بہاء الدین ابومحمد الخرقی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی، محی الدین مغربی، محمود بن عمر الجغمینی، الغ بیگ، غیاث الدین کاشی، قاضی زادہ رومی، مولانا علاء الدین قوشجی، میرم چلپی، امام الدین ریاضی، مرزا خیراللہ مہندس۔

ہ۔ جغرافیہ: ابن خردازبہ، ابن واضح الیعقوبی، ابوالحسن المسعودی، ابن رستہ، الجیہانی، ابن الفقیہ، ابن حوقل، المقدسی، ابن حائک الہمدانی، الادریسی، ابوالفداء، البکری، یاقوت، حمداللہ مستوفی۔

و۔ تاریخ: ابن اسحاق، ابن ہشام، الواقدی، ابن سعد، مدائنی، الکلبی، البلاذری، ابوالحسن المسعودی، ابن قتیبہ، ابن جریر الطبری، ابوریحان البیرونی، ابن مسکویہ، ابن الاثیر، ابوالفداء، ابن خلدون، عطا ملک جوینی، حمداللہ مستوفی، رشید الدین فضل اللہ، ابن الندیم، قاضی صاعد اندلسی، شہرستانی، ابن القفطی، ابن ابی اصیبعہ، ابوالحسن البیہقی، منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، ابوالفضل، عبدالقادر بدایونی، فرشتہ وغیرہم۔

یہ تو وہ فضلاء ہیں جو صرف دنیوی علوم میں اپنے وقت کے باکمال تھے۔ رہے علمائے دینیات تو اُن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کے علمی کمالات: لیکن یہ حضرات محض عالم ہی نہیں تھے، بلکہ صاحب ابتکار مفکر بھی تھے جن

کی جودت قریحہ اور ابتکار فکر نے علم و حکمت کی ثروت میں بیش بہا اضافے کئے۔ ذیل میں نمونتہً صرف ریاضی و ہیئت میں اُن کی عبقریت کے متعلق مبصرین یورپ کے تبصرے درج کئے جاتے ہیں۔ والفضل ماشہدت بہ الاعداء ...... کارادی وو لکھتا ہے:۔

"عربوں (مسلمانوں) نے سائنس میں واقعی بڑے کمالات حاصل کئے۔ انہوں نے صفر کا استعمال (علم الحساب یا ترقیم اعداد کا طریقہ) سکھایا، اگرچہ اُنہوں نے اسے ایجاد نہیں کیا تھا اور اس طرح وہ روزانہ زندگی کے علم الحساب کے بانی بن گئے۔ انہوں نے علم الجبر والمقابلہ کو ایک تحقیقی علم بنا دیا اور اسے بہت زیادہ ترقی دی۔ انہوں نے تحلیلی ہندسہ کی بنیاد ڈالی۔ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ علم المثلثات المستویہ اور علم المثلثات الکرویہ کے بانی تھے جو صحیح بات تو یہ ہے کہ اُن کے زمانہ سے پہلے وجود ہی میں نہیں آئے تھے، علم الہیئت میں انہوں نے قیمتی مشاہدات کئے۔"

اسی طرح مشہور مورخ ریاضیات کیجوری نے "تاریخ ریاضیات" میں لکھا ہے:۔

"پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ عربوں نے ریاضیات میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ لیکن حالیہ تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ اُنہیں ان ابتکارات کا شرف ملنا چاہیئے جو اس سے پہلے بعد کے لوگوں (اہل یورپ) کی دریافت سمجھے جاتے تھے۔"

کیجوری دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"ہم عربوں میں ایک قابلِ تعریف علمی سرگرمی پاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اُنہیں ایسے فرمانروا ملے تھے، جنہوں نے اپنی جود و سخا سے علمی تحقیقات کی ترقی میں بڑی مدد دی۔ خلفاء کے دربار میں اہلِ علم کے لئے کتب خانوں اور رصدگاہوں کا انتظام تھا۔ عرب مصنفین نے ہیئت اور ریاضی میں بکثرت کتابیں تصنیف کیں۔"

اس کے بعد اُس نے اُن پر فقدان عبقریت کے الزام کی تردید کی ہے:۔

"کہا گیا ہے کہ عرب عالم تھے مگر عبقری نہیں تھے۔ لیکن اُن کی تصنیفات کے جدید مطالعہ سے ہم مجبور ہیں کہ اس رائے پر نظر ثانی کریں۔ اُنہیں بہت سے اہم کمالات کا شرف حاصل ہے۔ اُنہوں نے درجہ سوم کی مساواتوں کو ہندسی طور پر حل کیا۔ علم المثلثات کو نمایاں درجہ تک مکمل کیا اور ریاضی، طبیعیات اور علم الہیئت میں بکثرت کمتر اہم اضافے کئے۔"

خصوصیت کے اُس نے اُن کی الجبرا کی دریافتوں کے بارے میں لکھا ہے :۔

"عرب درجہ دوم کی مساواتوں کے ہندسی حل سے واقف تھے۔ اب تیسرے درجہ کی مساواتوں کو ہندسی طور پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ..... مخروطات کے تقاطع کی مدد سے درجہ سوم کی مساواتوں کا حل علم الجبر والمقابلہ کی ترقی میں عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے .... لیکن مغرب (یورپ) میں عربوں کا تیسرے درجہ کی مساواتوں کا حل قریبی زمانہ تک غیر معلوم تھا "

اسی طرح اُس نے اُن کی ہیئتی سرگرمیوں کے بارے میں لکھا ہے :۔

"ہیئتی جداول (زیجیں) اور آلاتِ رصدیہ مکمل کئے گئے۔ رصدخانے تعمیر کئے گئے اور مسلسل مشاہدات فلکی کے قلم بند کرنے کا انتظام کیا گیا "

طب کے اندر چھ صدیوں تک شیخ بوعلی سینا کی "کتاب القانون" یورپی یونیورسٹیوں کے اندر نصاب میں داخل رہی۔ اس سے پہلے علی بن العباس المجوسی کی "کامل الصناعۃ" کا رواج تھا۔ ان کے علاوہ ابوبکر بن زکریا الرازی کی بہت سی طبی تصانیف وہاں مروج تھیں۔

غرض یورپ جو آج علم و حکمت کی روشنی سے پرتوستان بنا ہوا ہے، عرصہ تک مسلمانوں ہی کا خوشہ چیں رہا۔ پروفیسر ہٹی لکھتا ہے :۔

"مغربی یورپ عربی متون کے تراجم نیز عرب فلاسفہ کے نظامہائے فکر اور اُن کی شروح کے ذریعے سب سے پہلے ارسطاطالیسی نگارشوں سے واقف ہوا "

دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

"ریاضیات، علم الہیئت اور طب میں یونانیوں کے شاہکار .... ارسطو اور اس کے بعض یونانی شراح کی تصانیف .... اور مشاہیر عرب اور یہودی فلاسفہ اور ارسطو کے شارحین (کی کتابیں) اُن لاطینی تراجم کے ذریعے متعارف ہو رہی تھیں، جو عربی متون سے کئے گئے تھے "

یہ ہے اسلامی ثقافت کا تابناک ماضی جس پر اُس کے متبعین کی پس ماندگی کے پیشِ نظر مشکل ہی سے یقین آئے گا۔ مگر آنا چاہیئے، کیوں کہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے معاندین کی مخالفانہ سرگرمیاں بھی جھٹلا نہیں سکتیں۔

کیا تاریخ کا ایک ایسا درخشاں دَور اس بات کا مستحق نہیں ہے کہ اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اس کے اُن گوشوں کو جو اس درخشاں دَور کے نام لیواؤں کی غفلت وجمود سے اوجھل ہو چکے ہیں، تحقیقی سرگرمیوں کا موضوع بنایا جائے ؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب نہ صرف مسلمانوں ہی کو دینا ہے، بلکہ تاریخ تہذیب انسانی کے ماہرین بھی اُس کے لئے مکلّف ہیں !!

کتاب دعائم الاسلام

اُن محترم نے صدق جدید مورخہ ۳ جون ۶۶ء میں فاطمین کے مذہب پر جو تبصرہ ہے وہ بھی مناسب ہے۔ ہندوستان میں بوہرہ قوم کا یہ مذہب ہے۔ اور ان کے مذہب کی مستند کتاب دعائم الاسلام عربی میں ہے...... میرے ایک بوہرہ ملاقاتی نے کہا کہ آپ چونکہ متعصب نہیں اس لئے میں آپ کو اپنے مذہب کی کتاب جس کا نام دعائم الاسلام ہے، دیکھنے کو دیتا ہوں۔ چنانچہ دعائم دو جلدیں قلمی لکھی ہوئی مجھے دیں...... چنانچہ میرے ایک دوست نے ان کو پڑھ کر اس کے معنی بتلائے۔ پوری دونوں کتابوں کا مضمون تو یاد نہیں رہا۔ البتہ بعض ضروری باتیں یاد رہ گئیں۔ ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے بنی الاسلام علیٰ سبعۃ دعائم۔ ہمارے یہاں علیٰ خمس ہے۔ دعائم میں چھٹی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کا اقرار داخل ایمان ہے۔ ساتویں بات جہاد کی فرضیت کا اقرار بھی داخلِ ایمان ہے۔ دعائم میں لکھا ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "خدا.... لعنت کرے وہ کہتا ہے کہ جب تک تارے نہ نکل آئیں اور غروب کے بعد اندھیرا نہ ہو جائے روزہ مت افطار و" حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جب تک لوگ افطار میں جلدی اور سحری میں دیر کریں گے ان میں خیر و برکت رہے گی۔ ایک اور جگہ دعائم میں لکھا ہے کہ من تمتع فقد زنیٰ، یعنی جس نے متعہ کیا اس نے زنا کیا۔ تمام دعائم میں کسی پر بھی لعنت ملامت نہیں ہے، البتہ جناب علیؓ کی فضیلت کے بارے میں لکھا ہے کہ "لولا علی لہلک عمر" اس مذہب والے حضرت امام جعفر صادق کی حدیثوں کو مانتے ہیں۔ وضو کے لئے لکھا ہے وضو اس ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیئے جیسا قرآن پاک میں لکھا ہے۔ پاؤں دھونے کے بارے میں وارجلکم، اس لئے پاؤں کے مسح کو فرض مانتے ہیں اور پورے پاؤں دھونے کو مستحب کہتے ہیں۔ نماز میں تعدیل ارکان کو لازمی لکھا ہے۔ نماز میں ہاتھ نہیں باندھتے ہیں مالکیوں کی طرح ہاتھ چھوڑے رکھتے ہیں۔ (صدق جدید، لکھنؤ، ۲۶ اگست ۶۶ء)